ہارون کی آواز

ہارون کی آواز

نظمیں، غزلیں، ہائیکو

اور

ایک طویل نظم

سودا جو بے خبر ہے کوئی، وہ کرے ہے عیش
مشکل بہت ہے اُن کو، جو رکھتے ہیں آ گہی

حمایت علی شاعر

یاسر عرفات
کے نام

مِری زمیں ہے مِری ماں، میں ابنِ مریم ہوں
تمہارا خوں سے ہے رشتہ تو میرا دودھ سے ہے
حمایت علی شاعر

Himayat Ali Shair
C.B.45,Al-Falah Society
Shah Faisal Colony, Karachi-75230 Pakistan.
Ph: 92-21-4571322

تازہ ایڈیشن	2007ء
اہتمام	اوجِ کمال
کمپوزنگ	محمد شہزاد شفیق
قیمت	200 روپے

زیر اہتمام
ماہنامہ دنیائے ادب کراچی
6،623 فلور، ریگل ٹریڈ اسکوائر ریگل چوک، صدر۔ کراچی 74400
Ph: 92-21-8480816 / 0212018365
Cell: 0300-2797271 E-mail: dunyaeadab@yahoo.com

ترتیب

میں اور میرا فن — حمایت علی شاعر
تاثرات — پروفیسر ممتاز حسین
نقشِ ثانی — حمایت علی شاعر

نظمیں

جنت نگاہ
حسنِ بے نام
پیکرِ خیال
حسرتِ قرب
تری آنکھیں
تصویر تمہاری
ترک و طلب
تماشا
غمِ رائیگاں
تنہا تنہا
ادھوری کہانی
وہ
تیری باتیں، تیرے خواب
غمِ حاصل

میں کون ہوں، کیا ہوں، مری تحریر کہے گی
خاموش ہوا تو مری تصویر کہے گی

حمایت علی شاعر

جبرِ عہد
وحشتِ بام و در
کھلونے
چل خسرو گھر اپنے۔۔۔
مژدۂ نو
غمِ فردا
جاوداں
اقبال اور میں
آدمی کی کہانی
ترغیب
تین روپ
یارِ کج ادا

غزلیں

تنہائی میں قریبِ رگِ جاں ترا خیال
سامنے رشکِ قمر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں
یہ شہرِ رفیقاں ہے دلِ زار، سنبھل کے
اُس سے ملنے کی آس کیا شاعر
آج اے دل، لب و رخسار کی باتیں ہی سہی
اب تو ہر شورِ طرب سن کر دہل جاتا ہے دل
کوئی ہمدم نہیں، مونس نہیں، دم ساز نہیں
وقفِ غم و آلام کیے جاتا ہے مجھ کو
کیا کیا نہ زندگی کے فسانے رقم ہوئے
ایک سی ہے یوں تو کہہ لینے کو ہر اک دل کی بات
مدت سے یونہی شام و سحر جاگ رہے ہیں
رات کٹ جائے کسی طرح تو بس
یوں موت کو حیات کا انعام کر لیا
زخم کو پھول، حقیقت کو گماں کہتے ہیں
دل سے جو ترے غم کے پرستار نہ ہوتے
موت سے اے دل ڈرتے کب ہیں
بجا کہ اپنی دسترس میں لوح بھی، قلم بھی ہے
اہلِ دل، اہلِ خرد، اہلِ نظر سب سو گئے
ان کی جو راہ تھی وہ اسی پر چلا کیے
نہ جانے اہلِ نشیمن پہ کیا گھڑی آئی
کیوں ہو گئی اے شمع، تری بزمِ سخن چپ
میں جو کچھ سوچتا ہوں اب تمہیں بھی سوچنا ہوگا
اب بتاؤ جائے گی زندگی کہاں یارو

نظمیں

ملامت
زندگی اور پتھر
جشنِ آزادی
فسادات کی ایک رات

واحد متکلم ۔۔۔ جمع متکلم

(دلیل کم نظری قصۂ جدید وقدیم)

تلمود سے منسوب ایک حکایت ہے کہ

بچپن میں حضرت موسیٰ نے فرعون کے تاج کو ٹھوکر مار دی تھی۔

ستارہ شناسوں نے اسے بدشگونی قرار دیا اور بچے کی معصومیت مشکوک قرار پائی۔

امتحان لیا گیا۔

ایک تشت میں یاقوت کے ٹکڑے رکھے گئے اور دوسرے میں انگارے، بچے نے انگارہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔

فرعون تو مطمئن ہو گیا مگر یہ آگ بچے کی پہچان بن گئی۔

ید بیضا اور زبان کی لکنت اسی آگ کی امانتیں ہیں۔

حقیقت کا یہ افسانوی پس منظر درست ہو یا نہ ہو مگر یہ سچ ہے کہ حضرت موسیٰ کی زبان رواں نہ تھی۔ بائبل سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے اور قرآن حکیم سے بھی۔

’اے خدا، میں فصیح نہیں ہوں، نہ پہلے ہی تھا اور نہ جب سے تو نے اپنے بندے سے کلام کیا، بلکہ رک رک کر بولتا ہوں اور میری زبان کند ہے‘

(خروج ۱۰/۴)

’اے پروردگار، میرا سینہ کھول دے اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں‘

قرآن حکیم سے اس دعا کا بھی سراغ ملتا ہے جو انہوں نے اپنے بھائی ہارون کے لیے مانگی تھی۔

’میرا بھائی ہارون، مجھ سے زیادہ زبان آور ہے، اس کو میرے ساتھ (نبی بنا کر۔ الشعراء) مددگار کی حیثیت سے بھیج‘ (القصص)

اور اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول بھی کر لی۔

’میں نے تجھے فرعون کیلئے گویا خدا ٹھہرایا اور تیرا بھائی ہارون تیرا پیغمبر ہوگا‘ (خروج)

’ہم تیرے بھائی کے ذریعے تیرا ہاتھ مضبوط کریں گے‘ (القصص)

ان الہامی حوالوں کی روشنی میں اگر ہارون کو ’اظہار‘ کی علامت قرار دیا جائے تو شاعری، جزویست از پیغمبری کے مصداق ٹھہرتی ہے اور میرا یہ مصرعہ

ہارون کی زبان بھی لوحِ کلیم ہے

اپنے وسیع تر معنی آپ متعین کر لیتا ہے۔

مولانا گرامی نے علامہ اقبال کے لیے فرمایا تھا

پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

یقیناً شاعر پیغمبر نہیں ہوتا۔ حضرت موسیٰ ’کلیم اللہ‘ تھے اور شاعر ’تلمیذ الرحمٰن‘ شاید اسی اعزاز کے سبب یہ دنیا شاعر کا بھی امتحان لیتی ہے۔ اس کے سامنے بھی دو تشت رکھے جاتے ہیں اور ایک زندہ ضمیر شاعر، دولت کو ٹھکرا کر انگاروں کو اپنے سینے سے لگا لیتا ہے۔

اپنا تعارف کراتے ہوئے میر نے کہا تھا

میں کون ہوں اے ہم نفساں، سوختہ جاں ہوں
اِک آگ ہے سینے میں، جو میں شعلہ فشاں ہوں

یہ آگ نہ صرف شاعر کے تخلیقی جوہر کی امین ہوتی ہے بلکہ ان محرکات کا بھی سراغ دیتی

ہے جو ہمیشہ اسے اظہار کی حسرت میں مضطرب رکھتے ہیں۔غالب کے الفاظ میں

آتش کدہ ہے سینہ مرا، رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

اور جب اظہار کے لیے اقبال ایسا صاحبِ شعور نصیب ہوتا ہے تو وہ شاعر کا منصب بھی متعین کر دیتا ہے۔

مِری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

محرمِ راز ہونا ہی شعور کی دلیل ہے اور شعور۔زندگی کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھنے کا نام ہے علامہ اقبال نے اسی شعور کی روشنی میں زندگی کی بنیادی حقیقت کا انکشاف کیا تھا۔

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی، اسی کا مشتاق ہے زمانہ

لیکن شاعر صرف قریب تر کا مشتاق نہیں ہوتا۔وہ اس نامعلوم کو بھی امکانات کے حدود میں دیکھتا ہے۔جو ابھی پردہ افلاک میں ہے۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا، مرے آئینۂ ادراک میں ہے
(اقبال)

اور جب معلوم و نامعلوم کی سرحدیں مل جائیں تو عہدِ عتیق کو عہدِ حاضر سے اور موجود کو لاموجود سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ان کے درمیان اقدار کا ایک معنوی رشتہ برقرار رہتا ہے جو عہد بہ عہد، عمل اور ردِعمل کے مختلف مراحل سے گزرتا ہوا نئے امکانات کی صورت متعین کرتا ہے۔مثال کے طور پر:

حضرت یوسفؑ کے زمانے میں، حضرت یعقوبؑ کی امت نے قحط سالی کے سبب ارض کنعان سے ہجرت کر کے مصر میں بود و باش اختیار کر لی تھی لیکن دریائے نیل کے زرخیز کناروں پر صدیوں آباد رہنے کے باوجود وہ بے زمینی کے احساس میں مبتلا رہی۔اس کا سبب جہاں نسلی اور تہذیبی فرق تھا۔وہیں معاشرے کی وہ مخصوص درجہ بندی، معاشی حق تلفی اور سیاسی ناانصافی بھی تھی جن کے باعث رفتہ رفتہ عبرانیوں کو قبطیوں کا غلام بن جانا پڑا اور بالآخر اس کا انجام پوری قوم کی مراجعت پر منتج ہوا۔ظاہر ہے کہ فرعون کی مطلق العنان حکومت میں مظلوم طبقے کے حقوق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا، لیکن یہ صدی جسے جمہوری حقوق کی صدی کہا جاتا ہے، اس جبر سے آزاد ہے۔اس لیے ضروری نہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے لگے۔

جہاں تک تہذیبی آواگون سے گزر کر ایک نیا تشخص پانے کا مسئلہ ہے وہ قانونِ فطرت کا پابند ہے اور اس میں صدیاں صرف ہو جاتی ہیں لیکن جہاں تک مظلوم طبقات کی حق طلبی کا مسئلہ ہے فلسطین سے لے کر لاطینی امریکہ تک، ہر ملک میں ایک جدوجہد جاری ہے۔

میری شاعری میں عہدِ پارینہ کی مخصوص حکایات اور ان کے مختلف کردار جو اپنی پرچھائیاں تلاش کرتے نظر آتے ہیں ماضی و حال کے اسی جدلیاتی ربط کے آئینہ دار ہیں۔میں اس آئینے میں اُن حکایات کا نیا روپ اور اُن کرداروں کے نئے چہرے دیکھتا ہوں اور اس آگ کی روشنی میں جو میرے تخلیقی جوہر کی امین ہے، اپنے عہد کے ان پس پردہ محرکات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں جن کے سبب تاریخ کبھی اپنے آپ کو دہراتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور کبھی آگے بڑھتی ہوئی اور کبھی اس عالم میں جیسے اپنی جگہ ٹھہر کر رہ گئی ہو۔

افسانہ یاد آگیا اصحابِ کہف کا
تاریخ لکھنے بیٹھا تھا میں اپنے دور کی

اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا عہد کسی طلسم کا اسیر ہے اور ایک عالم خود فراموشی

ہے کہ ہم سب پر طاری ہے ۔

اعجاز دیدنی ہے طلسم سراب کا
دریار کا ہوا ہے بہے جا رہے ہیں ہم

اور میرے ذہن میں مختلف سوالات جاگ اٹھتے ہیں۔ میں کبھی نسل پرستی کے خلاف حضرت عیسیٰ کے اجتہاد کو استعارے کے طور پر اپنا کر حضرت مریمؑ سے سوال کرتا ہوں ۔

مریم، کہو کہ جائے یہ لخت جگر کہاں
اللہ کی زمین پہ ہے اس کا گھر کہاں

اور کبھی عالمی انسانی برادری کے خوبصورت تصور میں برادران یوسف کا کردار دیکھ چیخ پڑتا ہوں:

میں چاہ کنعاں میں زخم خوردہ پڑا ہوا ہوں
زمیں میں زندہ گڑا ہوا ہوں
کوئی مجھے اس برادرانہ فریب کی قبر سے نکالے
مجھے خریدے کہ بیچ ڈالے

پھر مجھے انجیل کی ایک حکایت یوں تسلی دینے لگتی ہے ۔

حیراں نہ ہو، یہ زہر ہے اپنی ہی کشت کا
اک رشتہ سانپ سے بھی ہے باغ بہشت کا

اور میں سوچنے لگتا ہوں

سانپ تو شیطان کا بہروپ تھا جس کے سبب باغ بہشت، حضرت آدمؑ سے چھن گیا

اور میرے ذہن میں وہ تمام سانپ پھنکارنے لگتے ہیں جنہوں نے انسانوں کو اپنی اپنی جنتوں سے محروم کر دیا اور میں ایک اندرونی کرب سے بے تاب ہو کر پھر چیخ پڑتا ہوں ۔

جب سانپ ہی ڈسوانے کی عادت ہے تو یارو
جو زہر زباں پر ہے وہ دل میں بھی اتر جائے

لیکن پھر وہ انجام بھی نظر میں گھوم جاتا ہے جو ہر بے زمین قوم کا مقدر ہے ۔

دشتِ غربت میں ہوں آوارہ مثال گردباد
کوئی منزل ہے، نہ کوئی نقش پا رکھتا ہوں میں

زندگی کے یہ تمام مسائل جو ان اشعار میں بکھرے ہوئے ہیں، میرے عہد کی منتشر حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن میں ایک مشترک صداقت پوشیدہ ہے اور میرے اندر چھپی ہوئی آگ اس صداقت کے اظہار کے لیے مضطرب رہتی ہے۔ کبھی شعلہ جوالا کی صورت تو کبھی راکھ کے اندر دہکتی ہوئی، کبھی چراغ کی لو کے مانند تو کبھی میرا بائی کے اس دوہے کی مثال:

لکڑی جل کوئلہ بھئی، کوئلہ جل بھئی آگ
میں پاپن ایسی جلی، کوئلہ بھئی نہ راکھ

میرے پہلے مجموعۂ کلام کا نام تھا ’آگ میں پھول‘ (مطبوعہ ۱۹۵۶ء) اور اس میں ایک طویل افسانوی نظم تھی ’شعلہ بے دور‘ (یہ نظم اب ’تشنگی کا سفر‘ میں ہے) یہ نظم میں نے ۱۹۵۶ء میں کہی تھی۔ اس دور میں میرے اندر جو آگ بھڑک رہی تھی اس کی تپش ہی کچھ اور تھی ۔

آگ لاشوں کے قلب کی دھڑکن
آگ پیہم سکوت کا طوفاں
آگ محرومیوں کی تشنہ لبی
آگ غربت کا آخری ارماں
اور یہ آگ کر گئی روشن
مجھ پہ تاریخ کے مقدس راز

ہر گناہ عظیم کے پیچھے
کس خدا کا ہے دست کا رداز

۱۹۶۲ء میں ایک طویل نظم تمثیلی نظم 'شکست کی آواز' میں یہ آگ ایک کردار کی معرفت مجھے اپنی حقیقت کا سراغ دیتی ہے۔(تشنگی کا سفر)

یہ بجھی آگ ہے؟ خوب آگ بجھی بھی ہے کہیں
آگ بجھ جائے تو زندہ بھی رہے گی یہ زمیں
یہ مہ و مہر ہیں کیا چیز اگر آگ نہیں
زندگی کے ہر اک ایوان میں پوشیدہ ہے آگ
زندگی کے ہر اک امکان میں پوشیدہ ہے آگ

پھر ۱۹۷۲ء میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ آگ میری روح کا عذاب بن گئی ۔

میرے سینے کے دہکتے ہوئے انگارے کو
اب تو جس طرح بھی ممکن ہو، بجھا دے کوئی

اور ۱۹۸۲ء میں جب ہر گفتنی ناگفتنی ہو کر رہ گئی تو مجھے اپنی ذات میں ایک 'اجتماعی نزاع' کی کیفیت محسوس ہونے لگی ۔

بدن پر پیرہن خاک کے سوا کیا ہے
مرے الاؤ میں اب راکھ کے سوا کیا ہے

تیس برس کے اس سفر میں آگ کی حدت کا جو گراف بنتا ہے وہ میری تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ اس المیے کا پس منظر اس عظیم المیے سے مختلف نہیں جو حضرت موسیٰ کی امت کا مقدر بن گیا تھا، فرعون کے تاج کو ٹھوکر مارنے اور انگارہ منہ میں رکھ لینے کے باوجود ان کی قوم سامری کے سحر کا شکار ہو گئی اور 'گوسالہ' کی پرستش کرنے لگی۔

'گوسالہ' زرپرستی کا جو استعارہ ہے

صدیاں گزر گئیں حتیٰ کہ بنی اسرائیل پر ایک نیا صحیفہ بھی اتار دیا گیا مگر یہ المیہ تاریخ پر محیط رہا اور آج بھی استہزائیہ لہجے میں اپنی قوم کا مرثیہ سنا رہا ہے ۔

'یہ معجزہ' بھی وقت کا کتنا عظیم ہے
اب دستِ سامری میں عصائے کلیم ہے

لیکن اسے تاریخ کی جدلیات کہیے کہ وقت کا انتقام۔ جس امت نے اپنے پیغمبر سے انحراف کیا۔ اسی امت کے ایک باغی مفکر کے قلم نے عصائے موسیٰ کی روایت تازہ کر دی اور اُس گوسالہ کا طلسم توڑ دیا جس نے ساری دنیا کو دولت کا پجاری بنا کر رکھ دیا تھا۔

آں کلیم بے تجلی، آں مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب
(اقبال)

قلم نے انسان کو کتاب دی اور کتاب نے حقیقت کا شعور اور آج شعور انسانی ایک فیصلہ کن منزل پر پہنچ چکا ہے ۔

کھینچی تھی جن کے خوف سے سند سکندری
سوئے نہیں ہیں آج وہ دیوار چاٹ کے

روایت ہے کہ یاجوج ماجوج جس دن یہ دیوار چاٹ لیں گے اس دن قیامت آ جائے گی اور قیامت کا مطلب ہے۔ روز حساب یعنی سزا و جزا کا دن۔

شہنشاہیت کا دفاع کرنے والی یہ دیوار شاید اسی قیامت کو روکنے کیلئے کھڑی کی گئی تھی سکندر ذوالقرنین سے لے کر اَبرہہ تک ہر استحصالی طاقت نے اپنے تحفظ کیلئے کہیں دیوار اٹھائی ہے تو کہیں گرانے کی کوشش کی ہے اور آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے ہر عہد ایک امتحان

سے گزر رہا ہے۔

اِک طرف اُڑتے 'ابابیل' اِک طرف 'اصحاب فیل'
اب کے اپنے کعبہ جاں کا مقدر دیکھنا

ظاہر ہے کہ سکندر کی فوج قیادت کو روک سکتی ہے، نہ ابرہہ کے ہاتھی کعبے کی دیوار گرا سکتے ہیں یہ وقت کا فیصلہ ہے اور وقت۔۔۔خدا ہے:

DON'T VILIFY TIME
BECAUSE TIME IS GOD

'زمانے کو برا نہ کہو۔۔۔زمانہ خدا ہے' (حدیث نبویؐ)

اور شاعر، تلمیذ الرحمٰن ہوتا ہے، وہ جس زبان سے بولتا ہے، وہ ہارون کی زبان ہے اور جس ہاتھ سے لکھتا ہے وہ ید بیضا کی طرح روشن ہے۔

مری ہتھیلی کہ جس میں روشن
وہ آگ بھی ہے، وہ نور بھی ہے
جو دستِ موسیٰ ہے، طور بھی ہے

لیکن اس روشنی میں لفظ و معنی کے قافلے کو لے کر شاعر فن کے جس پل صراط سے گزرتا ہے وہ بحر احمر پار کرنے کے مترادف ہے اگر اس کا قلم، عصائے کلیم کی طرح معجز نما نہ ہو تو وہ بیچ منجدھار میں ڈوب بھی سکتا ہے۔

تاریخ ادب میں کتنے ہی شاعر اس منجدھار کی نذر ہو گئے اور کون جانے کہ میرے نصیب میں کیا ہے۔

حمایت علی شاعر

شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی (۱۸/ جون ۱۹۸۵ء)

ہارون کی آواز

آدمی سے آدمی تک سفر میں بڑی قباحتیں ہیں۔ سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ آدمی خود اپنی راہ کا پتھر ہے اور پتھروں کے پیر نہیں ہوتے۔ آدمی بجائے خود ایک محشر خیال ہے اور محشر میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ہر شخص اپنی ہی آواز کی گونج کا شکار ہے اور یہ سب آوازیں ایک دوسرے کو توڑنے اور کاٹنے کے شوق فضول میں اپنی قوت بھی کھوتی جا رہی ہیں۔ مگر میرے دوست، میرے ہم عصر حمایت علی شاعر، شاعرانہ اسلوب کے ساتھ ساتھ ناقدانہ بصیرت بھی رکھتے ہیں، اِسی لیے اُسی پر ڈٹے رہتے ہیں۔ پھر وہ مباحثوں مناظروں اور مقابلوں سے بھی گریز نہیں کرتے۔

اُن کا عمل قصیدۂ شاہان کج کلاہ
اپنا عمل عمامہ و دستار کھینچنا

حمایت علی شاعر بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ اُن کی غزل کا مزاج بھی نظم سے ہی لگا کھاتا ہے۔ یوں بھی جدید غزل اپنے مزاج اور موضوعات میں نظم سے قریب تر ہے۔ یہ اس لیے بھی ہے کہ حمایت جذبہ و احساس سے زیادہ غور و فکر کے قائل ہیں، اُن کی شاعری جذبات اور جمالیات سے عاری تو نہیں ہے مگر اُس میں عقلی اور تجزیاتی عنصر زیادہ ہے۔ وہ اشیاء کو سرسری نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ اُن کی ماہیت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے اس تجزیاتی عمل میں مختلف کڑیوں کو ملا کر ایک مربوط اور مضبوط نتیجے تک پہنچنے کی سعی کرتے ہیں اور ان

کے ہاں اپنے سیاق وسباق سے کٹی ہوئی کوئی بات نہیں ہے، اُن کا حال ماضی سے مربوط اور مستقبل سے مشروط ہے جو رفتگاں اور آئندگاں کے درمیان ایک زندہ لمحے کی صورت میں موجود ہے۔ حمایت نے ماضی کو حال کا استعارہ اور حال کو مستقبل کا استعارہ بنایا ہے۔ وہ حکایت کو حقیقت سے جوڑنے کا ہنر جانتے ہیں ۔

افسانہ یاد آ گیا 'اصحاب کہف' کا
تاریخ لکھنے بیٹھا تھا میں اپنے دَور کی

ہم نے بہت کچھ اساطیرِ عجم سے حاصل کیا ہے، بہت کچھ ہندی دیومالاؤں سے لیا ہے ہمارے ہاں اپنی تاریخ، اپنی روایات، اپنی تہذیب، اپنی ثقافت اور اپنی زبان کے حوالے نہ ہونے کے برابر ہیں، حمایت نے اس کمی کو پورا کیا ہے۔ بائبل سے استفادہ تو عالمگیر ہے لیکن قرآن اور قصص الانبیاء سے استفادہ کی جو شعوری کوشش انہوں نے کی ہے۔ اردو شاعری میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی ۔

مانا کہ 'سامری' کی خدائی عظیم ہے
اب اپنے ہاتھ میں بھی 'عصائے کلیم' ہے

اِک طرف اڑتے 'ابابیل' اک طرف 'اصحاب فیل'
اب کے اپنے کعبہ جاں کا مقدر دیکھنا

ہر موج نیل ، سانپ سی بل کھا کے رہ گئی
اہرام کی نگاہ بھی پتھرا کے رہ گئی

کھینچی تھی جن کے خوف سے 'سد سکندری'
سوئے نہیں ہیں آج وہ 'دیوار' چاٹ کے

ہارون شرمسار کے موسیٰ سے کیا کہے
'گوسالے' کو جب امت موسیٰ خدا کہے

میں 'چاہ کنعاں' میں زخم خوردہ پڑا ہوا ہوں
زمیں میں زندہ گڑا ہوا ہوں
کوئی مجھے اس برادرانہ فریب کی قبر سے نکالے
مجھے خریدے اور بیچ ڈالے

حمایت علی شاعر دردمند دل رکھتے ہیں اُن کے دکھ سکھ بہت واضح ہیں۔ زمین سے محبت اور بے زمینی کا دکھ، زندگی سے محبت اور زندگی کی ماہیت کا دکھ، انسان سے محبت اور اس کی بے بسی کا دکھ، ارتقاء سے محبت مگر ترقی معکوس کا دکھ، استحصال اور ناانصافی، جبر واستبداد کے خلاف، چاہے وہ دنیا میں کہیں بھی ہو، حمایت علی کا ردعمل تلخ ہے اور کہیں کہیں طنز تک پہنچ جاتا ہے مگر یہ ردعمل فطری ہے۔ ایک ترقی پسند ذہن کا ردعمل کم از کم اتنا تو ہونا ہی چاہئے۔ دراصل حمایت علی شاعر انسان کو ایک اکائی تصور کرتے ہیں اور اُس کے دو نیم ہو جانے سے اُن کا دل بھی دو نیم ہے ۔

آرائشیں جدا سہی بنیاد ایک ہے
کعبے سے مختلف نہیں پتھر کنشت کا

اضداد کی یہ جنگ اصولِ قدیم ہے
اور اب کہ آدمی کی اکائی دو نیم ہے

بس حمایت ملوکیت اور ملکیت کے خلاف ہیں اسی لیے ان کی مخالفت سرمایہ داری اور جاگیرداری سے ہے۔ ملکیت کے تصور نے زمین کو اس کے بیٹوں پر تنگ کر دیا ہے تو ملوکیت نے مستقبل کے سب نقوش دھندلا رکھے ہیں اور نئی نسل کو محرومی کے عذاب سے دوچار کر دیا ہے اور یہ جو زیرِ زمین زلزلے دوڑتے پھرتے ہیں تو یہ بھی اس عذابِ محرومی کے سبب ہیں ۔

زمیں پر دھوپ کی چادر بچھائے لیٹے ہیں
مرے وطن، یہ تیرے خوش نصیب بیٹے ہیں

زیرِ زمین دوڑتے پھرتے ہیں زلزلے
ہم اس زمیں پہ پاؤں تو رکھیں مگر کہاں؟

حمایت علی شاعر کو انسان کی عظمت کا احساس بہت زیادہ ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس کو خالقِ حقیقی نے اپنا شاہکار ٹھہرایا ہو وہ کیسا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کے اندر تمام عالم سمائے ہوئے ہیں۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ علم کے ذریعہ، غور و فکر کے ذریعہ، اپنے آپ تک رسائی حاصل کرے۔ اپنی ذات کی حیرت انگیز صفات کو دریافت کرے اور اِن صفات سے کام لیتے ہوئے تمام کائناتوں کو مسخر کرے۔ مگر اس کے لیے ایک ایسے معاشرے کی ضرورت ہے جس میں انسان کو پھلنے پھولنے کے اور اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے تمام مواقع حاصل ہوں، جو ہر قسم کی چھوت چھات، تنگ نظری اور تعصّبات سے پاک ہو، جس میں دو شہریوں اور دو پڑوسیوں کے لیے مختلف

معیارات نہ ہوں۔ جس میں وسائلِ قدرت اور وسائلِ حیات سے استفادے کو محدود اور ممنوع نہ کیا گیا ہو ۔

شام وصال میں نہ ہو دھڑکا فراق کا
صبحِ فراق بھی بہ اُمید وصال ہو

مگر ان تصورات کے اظہار کے لیے ’موسیٰ کا عصا‘ اور ’ہارون کی آواز‘ چاہیے۔ سو حمایت نے اپنے قلم کو موسیٰ کا عصا اور اپنی زبان کو ہارون کی آواز بنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ شعر لکھتے ہیں مگر الفاظ سے زیادہ بین السطور پر زور دیتے ہیں۔ ان کا اصرار اخبار سے زیادہ نوشتہ دیوار پر ہے۔ اُن کی فکر کا مثلث انسان، زمین اور خدا ہے اور اپنی شاعری میں وہ اِن تینوں سے مختلف سطحوں اور مختلف پیرایوں میں مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں ۔

سورج کے گرد گھوم رہا ہوں زمیں کے ساتھ
اس گردشِ مدام سے مجھ کو امان دے
میں سچ تو بولتا ہوں مگر اے خدائے حرف
تو جس میں سوچتا ہے مجھے وہ زبان دے

شبنم رومانی

(مطبوعہ روزنامہ ’جنگ‘ کراچی)

میں جس کا مدح خواں ہوں

میں جس کا مدح خواں ہوں وہ انساں بھی ہے عظیم
اور اس کا اس جہان پہ احساں بھی ہے عظیم

اس نے زمیں کے ذروں کو اڑنا سکھا دیا
ہر آسماں کو پاؤں کے نیچے --- بچھا دیا
اُسطور سے رِہا کیا، فکر و خیال کو
انساں بنا دیا ہے خدا کے جمال کو
اس نے کہا --- کہ برتر و افضل ہے آدمی
ہر شئے ہے نا تمام --- مکمل ہے آدمی
ہر آدمی کے دل میں خدا کا وجود ہے
یہ آدمی ہے جس کے لیے ہست و بود ہے

انساں کے حق میں اس کا یہ فرماں بھی ہے عظیم
میں جس کا مدح خواں ہوں، وہ انساں بھی ہے عظیم

وہ شہرِ علم --- لفظ و معانی کا رشتہ داں
حدمکاں میں دیکھ لیا جس نے لامکاں
ہر چیز کے ظہور میں ہے ماورا کا نور
جیسے پس شعور ہے، اِک عکس لاشعور
ہر ذرہ اِک حقیقتِ کُل کا ہے آئینہ
گلزار جیسے وسعتِ گُل کا ہے آئینہ
ہر موت پیش رو ہے مسلسل حیات کی
کڑیاں جُڑی ہوئی ہیں فنا و ثبات کی

اس آگہی میں، فکر کا امکاں بھی ہے عظیم
میں جس کا مدح خواں ہوں، وہ انساں بھی ہے عظیم

محاسبہ

(بحضور سرورِ کائناتؐ)

حضورؐ، آپ کی امت کا ایک فرد ہوں میں
مگر خود اپنی نگاہوں میں آج گرد ہوں میں
میں کس زباں سے کروں ذکر اسوۂ حسنہ
کہ اہل درک و بصیرت نہ اہل درد ہوں میں
میں کس قلم سے لکھوں سرخیِ حکایتِ عشق
کہ رنگ دیکھ کے اپنے لہو کا، زرد ہوں میں
سمجھ سکوں گا میں کیا سرِ نکتہ معراج
شکست خوردۂ دنیائے گرم و سرد ہوں میں
بہ زعم خود تو بہت منزل آشنا ہوں مگر
جو راستے ہی میں اُڑتی پھرے وہ گرد ہوں میں

عجیب ذوق سفر ہے کہ صورت پرکار
جو اپنے گرد ہی گھومے، وہ رہ نورد ہوں میں
دہائیوں سے نچوڑا تھا جس اکائی کو
اب اس اکائی سے آمادۂ نبرد ہوں میں
بچھا رکھی ہے جو اک دست مکر نے ہر سو
اسی بساط سیاست پہ ایک نرد ہوں میں
میں اپنی ذات میں ہوں اپنی قوم کی تصویر
کہ بے عمل ہی نہیں جہل میں بھی فرد ہوں میں
حضورؐ آپ نے چاہا تھا کیا، ہوا کیا ہے
مگر میں سوچ رہا ہوں، مری خطا کیا ہے
فقط تلاوت الفاظ میرا سرمایہ
پس حروف ہے کیا، کب مجھے نظر آیا
کہی تھی آپؐ نے جو بات استعاروں میں
مرا شعور کب اس کا سفیر بن پایا
نہ میں نے سوچا کہ 'شق القمر' میں رمز ہے کیا
مری گرفت میں کس طرح آفتاب آیا
سوادِ غیب سے جبریل کی صدا نے مجھے

سماعتوں کے کس ادراک پر ہے اکسایا
نہ میں نے جانا کہ اک عکس لاشعور بھی ہے
جو حرف و صوت کی صورت ہے میرا ہم سایہ
میں اپنی ذات میں کس طرح ایک عالم ہوں
سمجھ سکی نہ کبھی میری فکر کم مایہ
نہ میرا عشق ہے میرے یقین کا حاصل
نہ میری عقل ہے میرے جنوں کی ہم پایہ
وہی عقائد افسوں زدہ، وہی اسطور
بدل کے شکل مری عقل کے ہیں ہم سایہ
کھلے تو کیسے کھلے مجھ پہ معنی اقرار
کہ میرے علم پہ ہے میرے جہل کا سایہ
نہ میں نے سوچا کہ قرآں کا مدعا کیا ہے
عروج آدم خاکی کی انتہا کیا ہے
میں بت پرست نہیں ہوں پہ بت شکن بھی نہیں
وہ مرد تیشہ بکف ہوں جو کوہکن بھی نہیں
میں کس کے نام لکھوں یہ ستم کہ اہل کرم
فقیہہ و صوفی و ملا ہیں، برہمن بھی نہیں

میں ایک چہرہ تھا اور اب ہزار چہرہ ہوں
اب اعتبار کے قابل مرا سخن بھی نہیں
میں روشنی کے بہت خواب دیکھتا ہوں مگر
اس انجمن میں جہاں شمع انجمن بھی نہیں
میں فکر بوذر و صبر حسین کا ورثہ
گنوا چکا ہوں تو ماتھے پہ اک شکن بھی نہیں
میں چل رہا ہوں کسی پیر تسمہ پا کی طرح
اگرچہ پاؤں میں میرے کوئی رسن بھی نہیں
مرا وجود ہے سنگ مزار کے مانند
کہ میرے ساتھ مری روح کیا، بدن بھی نہیں
میں شہر علم سے منسوب کیا کروں خود کو
کسی کتاب کا سایہ مرا کفن بھی نہیں
کہا گیا جسے قرآں میں بندۂ مومن
وہ میں تو کیا کہ مرا کوئی ہم وطن بھی نہیں
ہر اُمتی کی یہ فرد عمل ہے، کیا کیجئے
حضورؐ آپ ہی ہم سب کا فیصلہ کیجئے

○

بدن پہ پیرہن خاک کے سوا کیا ہے
مرے الاؤ میں اب راکھ کے سوا کیا ہے

یہ شہر سجدہ گزاراں، دیارِ کم نظراں
یتیم خانۂ ادراک کے سوا کیا ہے

تمام گنبد و مینار و منبر و محراب
فقیہہ شہر کی املاک کے سوا کیا ہے

کھلے سروں کا مقدر بہ فیض 'جہل خرد'
فریب سایۂ افلاک کے سوا کیا ہے

یہ میرا دعویٰ خود بینی و جہاں بینی
مری جہالت سفاک کے سوا کیا ہے

جہان فکر و عمل میں یہ میرا زعم وجود
فقط نمائش پوشاک کے سوا کیا ہے

تمام عمر کا حاصل بہ فضل رب کریم
متاعِ دیدۂ نمناک کے سوا کیا ہے

O

ازل سے ایک عذاب قبول درد میں ہوں
کبھی خدا تو کبھی ناخدا کی زد میں ہوں

خدا نہیں ہوں مگر زندہ ہوں خدا کی طرح
میں اک اکائی کے مانند ہر عدد میں ہوں

میں اپنا آپ ہی خالق ہوں آپ ہی مخلوق
میں اپنی حد سے گزر کر بھی اپنی حد میں ہوں

مرا تضاد ہی میری بقاء کا ضامن ہے
میں مطمئن ہوں اگر اپنے جزر و مد میں ہوں

یہی بڑائی ہے میری کہ آدمی ہوں میں
کہ اپنے جسم میں ہوں، اپنے خال و خد میں ہوں

O

جو آگ نہ تھی ازل کے بس میں
وہ آگ ہے میری دسترس میں

قدرت سے نبرد آزما ہوں
ہر چند ہوں جسم کے قفس میں

وہ لفظ ہوں کاتب ازل کا
اترا جو ہزارہا برس میں

ہر دور میں حرف حق کہا ہے
میں اب بھی نہیں ہوں پیش و پس میں

شاعر کی نظر ہی جانتی ہے
کتنے ہیں جہان خار و خس میں

O

کب تک رہوں میں خوف زدہ اپنے آپ سے
اک دن نکل نہ جاؤں ذرا اپنے آپ سے

جس کی مجھے تلاش تھی، وہ تو مجھی میں تھا
کیوں آج تک میں دور رہا اپنے آپ سے

دنیا نے تجھ کو میرا مخاطب سمجھ لیا
محوِ سخن تھا میں تو سدا اپنے آپ سے

تجھ سے وفا نہ کی تو کسی سے وفا نہ کی
کس طرح انتقام لیا اپنے آپ سے

لوٹ آ درونِ دل سے پکارے کوئی مجھے
دنیا کی آرزو میں نہ جا اپنے آپ سے

تناسخ

جب ایک سورج غروب ہوتا ہے
کم نظر لوگ یہ سمجھتے ہیں
اب اندھیرا زمیں کی تقدیر ہو گیا ہے
زمانہ زنجیر ہو گیا ہے

انہیں خبر کیا
کہ مہر و ماہ و نجوم سارے
تو روشنی کے ہیں استعارے

طلوع کا دل فروز منظر
غروب کا دل شکن نظارہ
ازل سے اس روشنی کا پرتو ہے
جو مسلسل سفر کے عالم میں
ہر مکاں، لامکاں کو اپنے جلو میں لے کر
رواں دواں ہے

یہ رات اور دن
ہر ایک ظاہر، ہر ایک باطن
ہر ایک ممکن
اسی تسلسل کا زیر و بم ہے
نگار فطرت کا حسن رم ہے

افق افق پر یہی رقم ہے
کہ جو عدم ہے
وہ زندگی کا نیا جنم ہے

پا بہ گِل

(انسانی ارتقاء کا ایک نفسیاتی مطالعہ)

صدیوں کا فاصلہ ہے جنگل سے میرے گھر تک
شاخِ ثمر بکف سے تخلیق کے ہنر تک
اس پا پیادگی سے، اس برق پا سفر تک

یہ فاصلہ ہے میرے ذہن رسا کا ضامن
منزل سے تا بہ منزل ہر نقش پا کا ضامن
ہر خواب، ہر حقیقت، ہر ارتقاء کا ضامن

اب میری دسترس میں، سورج بھی ہے ہوا بھی
یہ پرکشش زمیں بھی، وہ بے کشش خلا بھی
اب تو ہے میری زد میں دنیائے ماورا بھی

پھر بھی نہ جانے کیوں میں جنگل کو اتنا چاہوں
فردوس گم شدہ کے موہوم خواب دیکھوں
آنگن میں کچھ نہیں تو اک پیڑ ہی لگاؤں

گوسالہ

لوحِ کلیم ٹوٹ گئی ـــ پارہ پارہ ہے
ہارون شرمسار کہ موسیٰ سے کیا کہے
گو سالے کو جب امت موسیٰ خدا کہے
گوسالہ زر پرستی کا جو استعارہ ہے

لفظوں کے در کھلے تو معانی ہوئے عیاں
جاری ہے ہر خیال میں آزر کا سلسلہ
ٹوٹا نہیں حرم میں بھی پتھر کا سلسلہ
اک کارگاہِ سنگ ہے، شیشے کی ہر دکاں

گوسالہ اب بھی زندہ ہے دولت کے روپ میں
بدلے نہیں ہیں آج بھی آداب بندگی
اک سامری کا خواب ہے، ہر خواب بندگی
یہ رات، سایہ سایہ ہے سورج کی دھوپ میں

ید بیضاء

مری ہتھیلی کے سانپ کب تک ڈسیں گے مجھ کو
مری ہتھیلی کے سانپ جو، اب۔۔۔
مری رگوں میں اتر چکے ہیں
بدن کو زنجیر کر چکے ہیں

میں خواب دیکھوں تو کوئی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دے
قدم اٹھاؤں تو کوئی میرے قدم پکڑ لے
پلٹ کے دیکھوں تو کوئی پیچھے نہ کوئی آگے
بس ایک سایہ
مری حقیقت کا اک کنایہ

مری حقیقت کہ میں اندھیرے کی رہنمائی میں چل رہا ہوں
ازل سے اک سامری کے سانپوں میں پل رہا ہوں

مری ہتھیلی کہ جس میں روشن
وہ آگ بھی ہے وہ نور بھی ہے
جو دست موسیٰ ہے طور بھی ہے
جو اس عصاء کی تلاش میں ہے
جو ہر تہی دست کی متاع گراں بہا ہے
جو کشتگان طلسم زر کی حیات تازہ کا معجزہ ہے
جو عہد حاضر کے ساحروں
اور ان کے سانپوں کے واسطے
ضرب قضاء ہے

احتجاج

جو کاٹتے ہیں شاخِ گل، جو چھانٹتے ہیں برگ و بار
وہ جن کے نام کی دہائی دے ہر ایک شاخسار
انہیں خبر نہیں کہ برگ و بار کا
شجر شجر ہر ایک شاخسار کا
زمیں سے ایک رشتہ نمو بھی ہے
وہ رشتہ نمو جو سرخرو بھی ہے
ہر ایک شاخ ہاتھ میں گل و ثمر لیے ہوئے
نکل پڑے گی بطن خاک کے گہر لیے ہوئے
زمیں جو اس گہر سے آب دار ہے
یہ آفتاب کا زمیں سے پیار ہے
انہیں خبر نہیں، مجھے یقین ہے
زمین، آفتاب کی امین ہے
نمود گل، ثمر ہے دو دلوں کے امتزاج کا
یہ سر بلند شاخ گل، علم ہے احتجاج کا

O

اس شہر خفتگان میں کوئی تو اذان دے
ایسا نہ ہو زمیں کا جواب آسمان دے

پڑھنا ہے تو نوشتۂ بین السطور پڑھ
تحریر بے حروف کے معنی پہ دھیان دے

سورج تو کیا بجھے گا مگر اے ہوائے مہر
تپتی زمیں پہ ابر کی چادر ہی تان دے

اب دھوپ سے گریز کرو گے تو ایک دن
ممکن ہے سایہ بھی نہ کوئی سائبان دے

میں سوچتا ہوں اس لیے شاید میں زندہ ہوں
ممکن ہے یہ گمان، حقیقت کا گیان دے

میں سچ تو بولتا ہوں مگر اے خدائے حرف
تو جس میں سوچتا ہے، مجھے وہ زبان دے

سورج کے گرد گھوم رہا ہوں زمیں کے ساتھ
اس گردش مدام سے مجھ کو امان دے

میں تنگیِ مکاں سے نہ ہو جاؤں تنگ دل
اپنی طرح مجھے بھی کوئی لامکان دے

میری گواہی دینے لگے میری شاعری
یا رب مرے سخن کو وہ حسن بیان دے

نسبتِ خاک

زمیں سے کیوں نہ مجھے پیار ہو کہ میرا وجود
ازل سے تا بہ ابد خاک سے عبارت ہے
مرا خیال، مرے خواب، میری فکر و نظر
جسد سے تا بہ لحد خاک سے عبارت ہے

وہ مشتِ خاک جسے نور نے کیا سجدہ
خرد کے نت نئے سانچوں میں ڈھل رہی ہے آج
وہ آگ جس نے کیا انحراف عظمت خاک
خود اپنی ذات کے دوزخ میں جل رہی ہے آج

میں اپنی خاک سے کس طرح بے نیاز رہوں
مری زمیں مجھے جنت دکھائی دیتی ہے
وہ گفتگو جو سر عرش میرے حق میں ہوئی
خدا کے لہجے میں اب بھی سنائی دیتی ہے

میں اپنی خاک وطن سے جو پیار کرتا ہوں
تو اس لیے کہ مجھے اس سے خاص نسبت ہے
مرے وجود کی عظمت، مرا عروج و زوال
ازل سے تابہ ابد خاک سے عبارت ہے

O

پتھر میں ہیں ڈھلے ہوئے شبنم سرشت لوگ
دوزخ کو بھی بنائے ہوئے ہیں بہشت لوگ

گل کیا، ثمر بھی بانٹ رہے ہیں بصد خلوص
اپنا نصیب سمجھے ہوئے سنگ وخشت لوگ

سینے میں، آئینے کی طرح پاک صاف دل
معصوم و سادہ، بے خبر خوب و زشت لوگ

لوح کلیم سی وہ جبینیں کہ حرف حرف
پڑھ لیں خود اپنے عہد کی بھی سرنوشت لوگ

اک عمر کاٹ کر بھی طلسم سراب میں
سیراب کس قدر ہیں یہ بے آب وکشت لوگ

O

جو کچھ بھی گزرنا ہے، مرے دل پہ گزر جائے
اترا ہوا چہرہ مری دھرتی کا نکھر جائے

اک شہر صدا سینے میں آباد ہے لیکن
اک عالم خاموش ہے جس سمت نظر جائے

ہم بھی ہیں کسی کہف کے اصحاب کے مانند
ایسا نہ ہو، جب آنکھ کھلے وقت گزر جائے

جب سانپ ہی ڈسوانے کی عادت ہے تو یارو
جو زہر زباں پر ہے وہ دل میں بھی اتر جائے

کشتی ہے مگر ہم میں کوئی نوح نہیں ہے
آیا ہوا طوفان خدا جانے کدھر جائے

میں سایہ کیے ابر کے مانند چلوں گا
اے دوست جہاں تک بھی تری رہگزر جائے

میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ مری بات
خوشبو کی طرح اڑ کے ترے دل میں اتر جائے

○

حیراں نہ ہو یہ زہر ہے اپنی ہی کشت کا
اک رشتہ سانپ سے بھی ہے باغ بہشت کا

اچھا کیا کہ تو نے مرا گھر ہی ڈھا دیا
یوں بھی یہ اک فریب ہی تھا سنگ و خشت کا

آرائشیں جدا سہی، بنیاد ایک ہے
کعبے سے مختلف نہیں پتھر کنشت کا

اس کو رقم کرے گی مرے بعد نسل نو
جو باب رہ گیا ہے مری سر نوشت کا

بے زمین نسل کا نوحہ

ہر شخص اپنے گھر کی طرف جا رہا ہے اب
اے آسماں بتا کہ ہمارا ہے گھر کہاں

اللہ کی زمین پہ ڈھلتا ہوا یہ دن
کیا جانے چھوڑ آیا ہے اپنی سحر کہاں

سورج کے ڈوبتے ہی ہنسی کھلکھلا کے رات
اس رات میں جلائیں چراغ نظر کہاں

آغوش بام و در کہو، یا مامتا کی گود
اب مامتا کی گود بھی ہے معتبر کہاں

جس روشنی کے گرد اندھیرا ہو دور تک
اس روشنی کا ہو گا دلوں میں گزر کہاں

زیر زمین دوڑتے پھرتے ہیں زلزلے
ہم اس زمیں پہ پاؤں تو رکھیں مگر کہاں

سر پر جو بدلیاں تھیں، ہواؤں میں اڑ گئیں
اب سر پہ آسماں تو ہے، شانوں پہ سر کہاں

خاموش انتظار میں اک عمر کٹ گئی
لیکن شب فراق ہوئی مختصر کہاں

حد نگاہ پر جو ستارہ تھا، بجھ گیا
'اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں'

مریم سے ایک سوال

مریم تمہیں تو خون تھا اپنا بہت عزیز
تم نے اس کے واسطے سب سے لڑائی کی

تاریخ ہے گواہ کہ اپنی انا کے ساتھ
(لے کر خدا کا نام) تمہیں نے خدائی کی

تم نے حسب نسب کی روایت کو توڑ کر
رکھی بنا جہان میں آزاد اکائی کی

جس خوں سے سرخرو ہوئی مجروح مامتا
اس خوں نے آدمی کی بہت رہنمائی کی

جو ہاتھ پھول بن گیا شاخ صلیب پر
اس نے رخ حیات کی پردہ کشائی کی

مریم یہ خون بھی تو تمہارا ہی خون ہے
کیوں تم نے اپنے خون سے بے اعتنائی کی

اس خون میں مہک ہے تمہارے ہی دودھ کی
کیوں مامتا پہ شرط ہے اب کتخدائی کی

تم تو زمیں ہو، مرکز تخلیق زندگی
کیوں آج تم کو فکر ہوئی پارسائی کی

تم نے تو آدمی کو کیا تھا خدا صفات
تکذیب کی ہے کس لیے اپنی بڑائی کی

کیوں آج شرط رزق ہے یہ شجرۂ نسب
تم نے تو اپنے آپ سے بھی بے وفائی کی

مریم، کہو کہ جائے یہ لخت جگر کہاں
اللہ کی زمین پہ ہے اس کا گھر کہاں

پرانے سلسلے نئے رابطے

عمر ہو، جام تماچی ہو یا چنیسر ہو
تمہارا کوئی بھی ہو نام، کوئی مذہب ہو
تمہاری خاک سے میں ہوں، مرے لہو میں ہو تم
مرے خدا کی زمیں کا وقار تم سب ہو

وہ ماروی ہو کہ نوری، سسی ہو یا لیلاں
ہر ایک پیار بھرا دل، مری زمیں کا جمال
کراچی تابہ موئن جودڑو، مری تاریخ
ہر اک فسانہ، مری داستانِ ہجر و وصال

میں اپنی چاہ میں رانو، وفا میں رائے ڈیاچ
مرا سکون ہے سورٹھ، مرا جنوں بیجل
مرے وجود میں شہباز، روح میں سرمد
مرا دماغ لطیفی تو میرا دل سچل

مرا بدن مری دھرتی ہے جس کے دامن میں
بچھے ہوئے ہیں یہ دریا، مری رگوں کی طرح
یہ ریگ زار ہے میرا ہی ریزہ ریزہ جسد
مرے درخت ہیں سب میرے بازوؤں کی طرح

میں ابر بن کے اڑا تو میرے سمندر نے
مری ہواؤں کا جھولا بنا دیا مجھ کو
کیا گریز زمیں سے تو بے زمینی نے
وہ گردشیں دیں، بگولہ بنا دیا مجھ کو

میں گرد گرد کہیں تھا تو آب آب کہیں
سمیٹتا رہا پھر بھی زمیں کا چاک مجھے

دکھا کے مجھ کو مرا طرف کوزہ گر کی طرح
مرے حدود میں لے آئی میری خاک مجھے

مرا سفر مری تاریخ کا ہے آئینہ
وہ آئینہ جو شکستہ بھی ہے سلامت بھی
کسی کو اس میں نظر آئے کیا مرا پرتو
کہ میں بھی جس میں ہوں کچھ اور میری صورت بھی

یہ چہرہ جس کا ابھی کوئی نام ہے نہ نسب
یہ چہرہ میرا ہے، لیکن ہے یہ تمہارا بھی
وہ رابطہ کہ جو تاریخ میں ہے دفن کہیں
ہماری ہم نسبی کا ہے استعارہ بھی

تمہارے ورثہ اجداد کو خدا رکھے
مجھے بھی پیار مرے شہر ہست و بود سے ہے
مری زمیں ہے مری ماں میں ابن مریم ہوں
تمہارا خوں سے ہے رشتہ تو میرا دودھ سے ہے

موئین جوڈرو میں دوسرا آدمی

بدل گئے ہیں عقیدے، بدل گئی تہذیب
مگر وہ خون کہ آتی ہے جس سے بوئے حبیب
بدن کا دوست ہے لیکن دماغ و دل کا رقیب

لہو کا رشتہ، ازل اور ابد کا رشتہ ہے
بصد تضاد سہی، خال و خد کا رشتہ ہے
یہ آدمی کی دوئی میں احد کا رشتہ ہے

میں سوچتا ہوں کہ میرے ہزار نام سہی
میں زندگی کی مسافت میں بے مقام سہی
یہ میرے حال سے ماضی کا انتقام سہی

میں آج اپنے کھنڈر میں ہوں اپنے گھر کی طرح
یہ میرے ساتھ رہا میرے بام و در کی طرح
یہ شہر مجھ میں ہے زندہ، مرے ہنر کی طرح

میں اجنبی نہیں روح وطن، مجھے پہچان
میں تیرا خون ہوں، تیرا بدن مجھے پہچان
نہاں ہے مجھ میں ترا بانکپن مجھے پہچان

O

یہ معجزہ بھی وقت کا کتنا عظیم ہے
اب دست سامری میں عصائے کلیم ہے

وہ وقت ہے کہ لفظ سے معنی بچھڑ گئے
روئیں دوئی کو کیا کہ اکائی دو نیم ہے

ہارون کی آواز

دیکھو ابھی ہے وادی کنعاں نگاہ میں
تازہ ہر اک نقش کف پا ہے راہ میں
یعقوبؑ بے بصر سہی، یوسفؑ کی چاہ میں
لہرا رہا ہے آج بھی طرہ کلاہ میں
یہ طرہ گر گیا تو الٹ جائے گی زمیں
محور سے اپنے اور بھی ہٹ جائے گی زمیں

تاریخ کے سفر میں غلط بھی قدم اٹھے
گاہے لباس فقر میں اہل حشم اٹھے
گاہے صنم تراش بہ نام حرم اٹھے
پردے نگاہ کے بھی مگر بیش و کم اٹھے

یوں بھی ہوا۔۔۔ دہائی اکائی میں ڈھل گئی
خورشید کے الاؤ میں ہر شے پگھل گئی

جب یوں نہ ہو سکا تو یہ تاریخ ہے گواہ
اٹھے عصا بدست، غلامانِ کج کلاہ
زیرِ زمیں کشادہ ہوئی زندگی کی راہ
اور کچھ نہ کر سکی، کسی فرعون کی سپاہ
ہر موج نیل، سانپ سی بل کھا کے رہ گئی
اہرام کی نگاہ بھی پتھرا کے رہ گئی

اضداد کی یہ جنگ، اصول قدیم ہے
اور اب کہ آدمی کی اکائی دو نیم ہے
افلاک کے تلے سہی، مٹی عظیم ہے
ہارون کی زبان بھی، لوح کلیم ہے
حد سے گزر نہ جائیں کہیں کمترین لوگ
موسیٰ کے انتظار میں ہیں بے زمین لوگ

O

ہر پل گزشتنی ہے تو پھر کیوں ملال ہو
ممکن ہے کل یہ وقت بھی خواب و خیال ہو

شوق سفر میں گرد نہ اتنی اڑا کہ پھر
منزل پہ جا کے سانس بھی لینا محال ہو

اس کو ملے گی بھیک ہی جس طرح بھی ملے
کاسہ نما دراز جو دست سوال ہو

اب آگہی کی زد پہ ہیں صدیوں کے واہمے
لاکھ آسماں اٹھائے ہوئے اپنی ڈھال ہو

وہ عشق کیا جو حد جنوں تک نہ آ سکے
وہ لمس کیا جو موج صبا کی مثال ہو

جی چاہتا ہے اب وہ رت آئے کہ جس کے ساتھ
سورج کا غیظ ہو تو ہوا کا جلال ہو

پگھلے یہ برف ٹوٹ گریں خشک برگ و بار
آئے وہ فصل، شعلہ فشاں ہر نہال ہو

شام وصال میں نہ ہو دھڑکا فراق کا
صبح فراق بھی بہ امید وصال ہو

ہر لفظ میں ہو صورت معنی دلوں کی آگ
شعلہ بیاں یہ شاعر شیریں مقال ہو

یوسفِ ثانی

میں چاہ کنعاں میں زخم خوردہ پڑا ہوا ہوں
زمیں میں زندہ گڑا ہوا ہوں
کوئی مجھے اس برادرانہ فریب کی قبر سے نکالے
مجھے خریدے کہ بیچ ڈالے
کہ چشم یعقوب تو مرے غم میں کل بھی گریاں تھی
آج بھی ہے

کاش!

یہ سب اشجار کتنے خوبصورت ہیں
نظر آتا ہے
سب کڑیل جواں، دھرتی کے بیٹے
موسموں کا ظلم سہتے
سر اٹھائے اپنے پیروں پر کھڑے ہیں
اپنی ماں کو اپنے سائے میں لیے
سینہ سپر، میں
کاش میں بھی اک شجر ہوتا

O

خوش ہو رہے لوگ رقیبوں کے بخت پر
شہزادی سبا ہے، سلیماں کے تخت پر

بیٹھے ہوئے زمیں پہ جگالی میں، میں مگن
وہ جانور جو چڑھ نہیں سکتے درخت پر

شاید کہ راس آ گئیں جنگل کی وحشتیں
چونکا نہیں ہے کوئی صدائے کرخت پر

اب سوچتے ہیں، ابر ہے دوش ہوا پہ کیوں
کیوں آشیاں بناتے ہیں طائر درخت پر

پتوں کی تالیاں ہیں کہ گھوڑوں کی ٹاپ ہے
رکھنا نگاہ ہم سفرو اپنے رخت پر

کوئی تو ہو جو اشک بہائے مری طرح
بکھری ہوئی متاعِ دل لخت لخت پر

شاعر یہ کیا زمین چنی شعر کے لیے
تیشہ چلائے جیسے کوئی سنگ سخت پر

○

وہ ستارہ کہ جو دیکھو تو شب آثار بھی ہے
سوچیۓ تو وہی سورج کا پرستار بھی ہے

صرف دیوار کو رستے کی رکاوٹ نہ سمجھ
پس دیوار کہیں، سایۂ دیوار بھی ہے

یہ الگ بات کہ میں ہی نہیں یوسف ورنہ
بکنا چاہوں تو یہاں مصر کا بازار بھی ہے

نقد جاں چھیننے والوں سے کوئی یہ کہہ دے
مرے قبضے میں ابھی دولت پندار بھی ہے

وہ بھلا کیسے سکوں پائے کہ جس کی قسمت
دل حساس بھی ہے، دیدۂ بیدار بھی ہے

اک عذاب اور بھی ہے اہل وفا پر نازل
حسن کا پاس تو ہے، عشق کا پندار بھی ہے

یہ عجب کیفیت دل ہے کہ سب کچھ کہہ کر
اک خلش ہے کہ ابھی تشنۂ اظہار بھی ہے

میں تو یوں چپ ہوں کہ آئے نہ ترے ذوق پہ حرف
جو سخن فہم ہے، غالب کا طرفدار بھی ہے

چپ کا لمحہ

ذرا شور کم ہو تو سوچوں
یہ خاموش الفاظ کیا کہہ رہے ہیں
ابھی تو وہ عالم ہے
گویا میں نقار خانے میں ہوں
میری اپنی ہی آواز مجھ کو سنائی نہیں دے رہی ہے
میں کیوں لفظ ضائع کروں
زبان اور قلم کا گنہ گار بن کر
میں کیا کر سکوں گا

صحافت

ہر اک اخبار۔۔۔ یوں لگتا ہے
مجرم کا کٹہرا ہے
کٹہرے میں کھڑا ہر لفظ
جمہوری عدالت میں
صداقت کی قسم کھا کر
نیا اک جھوٹ گھڑتا ہے

○

آنکھ کی قسمت ہے اب بہتا سمندر دیکھنا
اور پھر اک ڈوبتے سورج کا منظر دیکھنا

شام ہو جائے تو دن کا غم منانے کے لیے
ایک شعلہ سا منوّر اپنے اندر دیکھنا

روشنی میں اپنی شخصیت پہ جب بھی سوچنا
اپنے قد کو اپنے سائے سے بھی کمتر دیکھنا

سنگ منزل، استعارہ، سنگ مرقد کا نہ ہو
اپنے زندہ جسم کو پتھر بنا کر دیکھنا

کیسی آہٹ ہے، پس دیوار آخر کون ہے
آنکھ بنتا جا رہا ہے، روزن در دیکھنا

ایسا لگتا ہے کہ دیواروں میں در کھل جائیں گے
سایۂ دیوار کے خاموش تیور دیکھنا

اک طرف اڑتے ابابیل، اک طرف اصحاب فیل
اب اپنے کعبہ جاں کا مقدر دیکھنا

صفحۂ قرطاس ہے یا زنگ خوردہ آئینہ
لکھ رہے ہیں آج کیا اپنے سخنور دیکھنا

تیسری ہجرت

(سرور بارہ بنکوی کے انتقال پر)

سرور تم بھی چلے گئے ہو
خدا کی یہ سرزمیں تمھیں بھی نہ راس آئی
تمہارے دل میں بھی رفتگاں کی طرح کوئی غم
سلگ کے ناسور بن گیا تھا
جسے تم اپنے حسین اشعار میں چھپا کر
شکستہ دل ساتھیوں کو تسکین دے رہے تھے
یہ زہر غم جس کو پی کے تم نیل کنٹھ کی طرح جی رہے تھے
کسے خبر تھی
تمھیں اس ایثار کا وہ اجر عظیم دے گا
کہ تم وطن در وطن نئی ہجرتوں کے پیہم عذاب کی اک مثال بن کر
ہماری تاریخ کے لیے اک سوال بن کر
خدا کی اس سرزمیں کا احساں اتار دو گے
ہر اک غریب الوطن کو اپنے مآل کا انتظار دو گے

O

جوش نمو میں سر جو اٹھاتی ہیں ڈالیاں
پتے ہوا کی شہ پہ بجاتے ہیں تالیاں

اس رقص بے خودی میں چھلک کر نہ گر پڑیں
شاخوں کے ہاتھ سے کہیں پھولوں کی پیالیاں

یہ کہہ کے اڑ گئے ہیں پرندے درخت سے
کرتے رہو زمین پہ بیٹھے جگالیاں

گنبد کی طرح دوش پہ رکھے ہوئے ہیں سر
جسموں کے مقبروں میں دریچے نہ جالیاں

جلوت گریز ہی سہی، خلوت میں دیکھنا
کیا گل کھلا رہی ہیں تری پردے والیاں

شاہی حرم سے 'شاہی محلّہ' تک آ گئیں
شام اودھ کے ساتھ کراچی کی چالیاں ٥

مسی کی سب سیاہیاں دل میں اتر گئیں
ہونٹوں پہ خون دل کی ابھر آئیں لالیاں

الفاظ کی منڈیر سے نیچے اتر کے دیکھ
بین السطور سے جو گذرتی ہیں نالیاں

وہ تو دکھا رہا ہے ہتھیلی میں سبز باغ
یاں آمد بہار کی ہیں خوش خیالیاں

٥مزدوروں کے گھر

غم مشترک

(یوم مئی)

یہ غم، تمہارا غم نہیں، مزدور ساتھیو
یہ غم ہمیں بھی کم نہیں، مزدور ساتھیو
انداز مختلف سہی، منصب تو ایک ہے
جب تم نہیں تو ہم نہیں، مزدور ساتھیو

گولی چلی جو تم پہ تو ہم بھی ہوئے شہید
تیشے کے ساتھ لوح وقلم بھی ہوئے شہید

جو خون قتل گاہ شکاگو میں بہہ گیا
وہ داغ بن کے دامن مغرب پہ رہ گیا
وہ خون بے ضمیر نہ تھا، بے صدا نہ تھا
خاموش ہو کے جبر کا ہر راز کہہ گیا

یہ دن شعور جبر کے اظہار کا ہے دن
صدیوں میں ایک لمحہ بیدار کا ہے دن

وہ لمحہ جس نے فکر کا دھارا بدل دیا
صدیوں کی پستیوں کو ابھارا بدل دیا
تاریخ کے عمل میں صداقت کو جانچ کر
زندہ حقیقتوں کو نکھارا بدل دیا

اب آئینہ ہی اور ہے صورت ہی اور ہے
نوع بشر سے شرط رفاقت ہی اور ہے

اب آدمی نے جان لیا آدمی کا فن
انسانیت کا نام ہے اور زرگری کا فن
معیار خوب و زشت بدل کر بصد وقار
مردہ دلوں نے سیکھ لیا زندگی کا فن

مانا کہ سامری کی خدائی عظیم ہے
اب اپنے ہاتھ میں بھی عصائے کلیم ہے

ہم تم گزر کے آئے ہیں جس پل صراط سے
وہ اک سحر کی جنگ مسلسل تھی رات سے
اب فتح کے قریب ہے سورج کا مورچہ
اب چھوٹنے نہ پائے کوئی ہاتھ، ہاتھ سے

بڑھتے چلو کہ سامنے جو رہگزار ہے
کیوباسے ویت نام تلک استوار ہے

انقلاب

زمین کو آخر جلال آیا
فلک کا عہد زوال آیا
بپھر اٹھا ہے ہر ایک جنگل
نکل پڑے چھاپہ ماروں کے دل
پہاڑ ڈھالوں میں ڈھل گئے ہیں
درخت بھالوں میں ڈھل گئے ہیں
بنا ہوا ہے ہر ایک ذرہ
برستی گولی لپکتا چھرہ
ہر ایک دریا ہے ناگ جیسا
لہو ہے سیال آگ جیسا
خدائے زر سے ٹھنی ہوئی ہے
زمین سورج بنی ہوئی ہے

O

ہر لفظ سے معانی تہہ دار کھینچنا
جو نقش ہو وہ نقش بہ دیوار کھینچنا

کیا لوگ تھے کہ ہجر میں تھا جن کا مشغلہ
عکس جمال یار طرح دار کھینچنا

ان کو تھی ایک فکر، کہ فکر سخن کہیں
ہم کو یہ زندگی گراں بار کھینچنا

اپنا نصیب، فکر معاش اور غم معاش
ان کا نصیب، عشق کا آزار کھینچنا

ان کا عمل، قصیدہ شاہان کج کلاہ
اپنا عمل، عمامہ و دستار کھینچنا

O

اِک سنگدل کا پھر ہے مقدر بنا ہوا
ہر آدمی ہے شہر میں پتھر بنا ہوا

گوتم سے شرمسار، ارسطو ہے یا نہیں
پورس کی سرزمیں پہ سکندر بنا ہوا

اس کو ستم نصیب کہوں یا ستم نواز
جو آدمی ہے صبر کا پیکر بنا ہوا

کیا جانے کب نیام سے باہر نکل پڑے
جو ہاتھ آستیں میں ہے خنجر بنا ہوا

تجھ کو نظر نہ آئے تو میری نظر سے دیکھ
آئینے کے ادھر ہے جو منظر بنا ہوا

بنیاد پر نظر ہو تو شاید سمجھ سکو
کیوں ٹوٹنے لگا ہے مرا گھر بنا ہوا

یہ بات ظرف کی ہے مگر کس سے کیجئے
قطرہ بھی آج کل ہے سمندر بنا ہوا

O

زمیں پہ دھوپ کی چادر بچھائے لیٹے ہیں
مرے وطن یہ ترے خوش نصیب بیٹھے ہیں

O

اب کیا فلک کی بات کریں ہم زمین پر
سائے گماں کے چھائے ہوئے ہیں یقین پر

گر پڑھ سکو نوشتۂ بین السطور کو
دل کا ہر ایک حال رقم ہے جبین پر

اب اس قدر بھی دعویٔ مہر و وفا نہ کر
پڑنے لگی نگاہ تری آستین پر

ڈرتا ہوں تیرے قول و عمل کے تضاد سے
الزام آ نہ جائے کہیں تیرے دین پر

O

شاید بِنا رکھی ہے ہماری ہواؤں پر
اب تک گزر رہی ہے بقاء کی دعاؤں پر

محسوس ہو رہا ہے گراں گوش ہے یہ عہد
رکھ دی بساط حرف جو ہم نے صداؤں پر

گل کاریوں سے لاکھ چھپاؤ لہو کے داغ
چہرے بنے ہوئے ہیں تمہاری قباؤں پر

اک چیخ جیسے ہو گئی ساکت فضاؤں میں
اب کے عجیب سحر ہے طاری نواؤں پر

تیری جفا بھی مصلحت آمیز تھی اور آج
تو چاہتا ہے شک نہ ہو تیری وفاؤں پر

پتھر تھے کل، اور آج ہیں انساں کے روپ میں
یارب کوئی عذاب، زمیں کے خداؤں پر

شاعر خرید لو کہ خطا پوش ہے عبا
باطن کا کوئی قرض نہیں پارساؤں پر

O

خدا تو ایک ہے لیکن خدا کے گھر ہیں بہت
کہ ملکیت کے بہانے، زمین پر ہیں بہت

اسی بہانے مقدر کا فیض جاری ہے
فقیہہ شہر کے فتوے بھی معتبر ہیں بہت

غریب کے لیے دنیا میں ایک چھت بھی نہیں
امیر کے لیے دیوار و بام و در ہیں بہت

غریب کے لیے دنیا، سرائے فانی ہے
امیر کے لیے جینے کے بھی ہنر ہیں بہت

غرض عجیب ہے یہ اہل شرع کی منطق
خداودیں کے سہارے ہی، اہل زر ہیں بہت

جنہیں خود اپنے سوا کچھ نظر نہیں آتا
مری نگاہ میں ایسے بھی دیدہ ور ہیں بہت

یہ پھول چاند ستارے، اسی کا پرتو ہیں
وہ ہم سفر نہ سہی، میرے ہم سفر ہیں بہت

O

اک جبر وقت ہے کہ سہے جا رہے ہیں ہم
اور اس کو زندگی بھی کہے جا رہے ہیں ہم

اعجاز دیدنی ہے طلسم سراب کا
دریا رکا ہوا ہے، بہے جا رہے ہیں ہم

رہنے کی یہ جگہ تو نہیں ہے مگر یہاں
پتھر بنے ہوئے ہیں، رہے جا رہے ہیں ہم

اونچی عمارتوں پہ ہے تعمیر کا گماں
اور اندرونِ ذات ڈھے جا رہے ہم

یہ دل کی تیرگی ہے کہ قسمت کی تیرگی
سورج کی روشنی میں گھے جا رہے ہم

رُباعی

تم ہی نہیں قسمت کے ہیں ہیٹے ہم بھی
برسوں سے ہیں دکھ درد سمیٹے ہم بھی
کیا تم سے کہیں اپنی تباہی کا سبب
نادان اب وجد کے ہیں بیٹھے ہم بھی

O

زباں تو چپ ہے لیکن دل کہاں چپ رہنے والا ہے
صداؤں کے جہاں میں خامشی کا بول بالا ہے

ہمارے گرد تو خیر ایک مدت سے ہے تاریکی
وہ کیا دیکھے گا جس کے گرد اجالا ہی اجالا ہے

O

دن ہی رہا نہ دن کی کوئی بات رہ گئی
آنکھوں میں کاٹنے کے لیے رات رہ گئی

اک زنگ خوردہ آئینہ ہاتھوں میں آ گیا
اور دیکھنے کو صورت حالات رہ گئی

وہ لمس لمس پھول سا کھلتا ہوا بدن
خوابوں میں اس کے قرب کی سوغات رہ گئی

وہ تو چلا گیا مگر اس کے جمال کی
نادیدہ روشنی سی مرے ساتھ رہ گئی

O

اب کیا غزل میں بات کریں اس کے جور کی
حالات اپنے اور حکایات اور کی

اخبار سے زیادہ ہے دیوار معتبر
شاید ہو آپ کے لیے یہ بات غور کی

افسانہ یاد آ گیا اصحاب کہف کا
تاریخ لکھنے بیٹھا تھا میں اپنے دور کی

O

تعمیر کے ہیں خواب مگر سطح آب پر
کشتی چلائی جاتی ہے موج سراب پر

جس کے سرور میں نہ ہو بیدار روح عصر
اک بوجھ ہے وہ نغمہ بھی تار رباب پر

جس میں ترے بدن کا ہو گلشن کھلا ہوا
سو جنتیں نثار ہیں اس ایک خواب پر

لاتی ہے اپنے ساتھ ہی طوفان رنگ و بو
وہ موج گل جو آئی ہوئی ہو شباب پر

جوش نمو سے آپ کھلے ہیں قبا کے بند
نشہ ہے اپنے خوں کا بدن کے گلاب پر

چراغ بجھ گیا

(منظر اکبر کے انتقال پر)

لوگ ملتے ہیں سر راہ بچھڑ جاتے ہیں
لیکن اک دوست جو دل میں رہا دھڑکن بن کر
وادیٔ جاں میں رہا، روح کا مسکن بن کر
اپنے پیکر میں جو اک پیکر محبوبی تھا
یوں تو تنہا تھا، مگر انجمن خوبی تھا
اس کے چہرے میں تھی کیا بات، بتاؤں کیسے
شاخِ سر سبز پہ کھلتا سا شگوفہ جیسے
گفتگو ایسی کہ محفل ہی دگر ہو جاتی
قہقہہ مار کے ہنستا تو سحر ہو جاتی

وہ ملاقات کا انداز کہ دل کھل جائیں
جیسے بچھڑے ہوئے برسوں کے بہم مل جائیں
اجنبی کو بھی مرے یار نے اپنا سمجھا
اپنی آنکھوں ہی کا کھویا ہوا سپنا سمجھا
ظرف ایسا کہ کوئی عالم وحشت آئے
اس کے لب پر نہ کبھی حرف شکایت آئے
اس نے ہم سب کی طرح دکھ بھی اٹھائے تھے بہت
زخم احباب کے ہاتھوں سے بھی کھائے تھے بہت
کام کرتا رہا، چلتا رہا اک عزم کے ساتھ
بزم آراء تھا، نبھاتا رہا ہر بزم کے ساتھ
مہر کے نام پہ یا قہر کی صورت گزری
اس نے ہنس ہنس کے سہی، جو بھی قیامت گزری
ایسا انسان جدا ہو یہ غضب ہے کہ نہیں
اپنے اللہ کی رحمت بھی عجب ہے کہ نہیں
لوگ ملتے ہیں سر راہ بچھڑ جاتے ہیں
جیسے ہم اجڑے ہیں، کب ایسے اجڑ جاتے ہیں

بازیافت

مدت کے بعد تم سے ملا ہوں تو یہ کھلا
یہ وقت اور فاصلہ دھوکہ نظر کا تھا
چہرے پہ عمر بھر کی مسافت رقم سہی
دل کے لیے تمام سفر، لمحہ بھر کا تھا

کیسی عجیب ساعت دیدار ہے کہ ہم
پھر یوں ملے کہ جیسے کبھی دور ہی نہ تھے
آنکھوں میں کم سنی کے وہ سب خواب جاگ اٹھے
جن میں نگاہ و دل کبھی مجبور ہی نہ تھے

معصوم کس قدر تھیں وہ بے نام چاہتیں
بچپن سے ہم کنار تھا عہد شباب بھی
یوں آتش بدن میں تھی شبنم گھلی ہوئی
مہتاب سے زیادہ نہ تھا آفتاب بھی

پھر وہ ہوا چلی کہ سبھی کچھ بکھر گیا
وہ محفلیں، وہ دوست، وہ گلرنگ قہقہے
اب رقص گردباد کی صورت ہے زندگی
یہ وقت کا عذاب کہاں تک کوئی سہے

اب تم ملیں تو کتنے ہی غم ہیں تمہارے ساتھ
پتھر کی طرح تم نے گزاری ہے زندگی
کتنا لہو جلایا، تو یہ پھول مسکرائے
کس کس جتن سے تم نے سنواری ہے زندگی

میں نے بھی ایک جہد مسلسل میں کاٹ دی
وہ عمر، تھی جو پھول سے ارماں لیے ہوئے

اب وہ جنوں رہا ہے نہ وہ موسمِ بہار
بیٹھا ہوں اپنا چاک گریباں سیے ہوئے

اب اپنے اپنے خوں کی امانت ہے اور ہم
اور ان امانتوں کی حفاظت کے خواب ہیں
آنکھوں میں کوئی پیاس ہو، دل میں کوئی تڑپ
پھیلے ہوئے افق سے افق تک سراب ہیں

کس کو خبر تھی لمحہ اک ایسا بھی آئے گا
ماضی تمام پھر سمٹ آئے گا، حال میں
محسوس ہو رہا ہے کہ گزرا نہیں ہے وقت
اک لمحہ ڈھل گیا تھا فقط ماہ و سال میں

تم بھی وہی ہو، میں بھی وہی، وقت بھی وہی
ہاں اک بجھی بجھی سی چمک چشمِ نم میں ہے
یہ لمحہ جس کے سحر میں کھوئے ہوئے ہیں ہم
کتنی مسرتوں کا سرور، اس کے غم میں ہے

حریفِ وصال

عجیب شب تھی
جو ایک پل میں سمٹ گئی تھی
عجیب پل تھا
جو سال ہا سال کی مسافت پہ پرفشاں تھا
اور اس کے سائے میں ایک موسم ٹھہر گیا تھا
(کسی کے دل میں تھا کیا، کسی کو خبر نہیں تھی)

بس ایک عالم سپردگی کا
بس ایک دریائے تشنگی تھا کہ جس کی موجیں

اڈ اڈ کر بکھر رہی تھیں
کھلے سمندر میں ڈوب جانے کی آرزو میں مچل رہی تھیں

خیال۔۔۔حسن خیال میں گم
نگاہ۔۔۔خواب جمال میں گم
نہ جانے کس خواب کی یہ تعبیر تھی کہ آنکھوں میں جاگتی تھی
نہ جانے کس آرزو کی تکمیل ہو رہی تھی
کہ آنکھ سے آنکھ
لب سے لب محو گفتگو تھے
مگر بس اک بات معتبر تھی
کسی کے دل میں تھا کیا، کسی کو خبر نہیں تھی

وہ لمحہ گزرا کہ سحر ٹوٹا
یکا یک احساس عمر جاگا
ہر ایک چہرہ خود اپنی آنکھوں میں آئینہ ہو گیا ہو جیسے
طلسم سم سم سے جس خزانے کا در کھلا تھا

وہ یک بہ یک کھو گیا ہو جیسے
عجیب تھا ایک چور دل میں
جو اس خزانے کا پاسباں تھا
جو سائے کی طرح درمیاں تھا

تقاضۂ ماہ و سال تھا وہ؟
کہ دل کی گہرائیوں میں بیدار
کوئی خوف مال تھا وہ
عجیب سا اِک خیال تھا وہ
ہجوم جذبات میں در آیا تھا جو حریف وصال بن کر
جو دل کی دھڑکن میں رک گیا تھا، ضمیر کا اِک سوال بن کر

○

یہ آرزو ہے کہ جب بھی گلے لگاؤں اُسے
حصارِ ذات سے باہر نکال لاؤں اُسے

وہ جل رہا تھا کڑی دھوپ کی تمازت میں
ملا جو اب تو اڑھا دوں گا اپنی چھاؤں اُسے

یہ عشق بھی ہے عجب امتحان عہد وفا
وہ آزمائے مجھے اور میں آزماؤں اُسے

وہ شہر، شہرِ چراغاں سہی، مگر اِک دن
ہوائیں یاد دلائیں گی اپنا گاؤں اُسے

وہ اپنے خواب میں شاید مجھی کو دیکھتا ہو
میں تشنہ لب سہی، سوتے میں کیا جگاؤں اُسے

○

چاند نے آج جب اِک نام لیا آخر شب
دل نے خوابوں سے بہت کام لیا آخر شب

ہائے وہ خواب کہ تعبیر سے سرشار بھی تھا
اُس کی آنکھوں سے جو انعام لیا آخر شب

ہائے کیا پیاس تھی، جب اُس کے لبوں سے میں نے
مسکراتا ہوا اِک جام لیا آخر شب

میں جو گرتا بھی تو قدموں میں اُسی کے گرتا
اُس نے خود بڑھ کے مجھے تھام لیا آخر شب

زندگی بھر کی مسافت کا مداوا کہیے
اُس کی باہوں میں جو آرام لیا آخر شب

○

تخاطب ہے تجھ سے، خیال اور کا ہے
یہ نکتہ وفا میں بڑے غور کا ہے

وہ خلوت میں کچھ اور جلوت میں کچھ ہے
کرم اس کا مجھ پر عجب طور کا ہے

مرا چہرہ بھی، میرا چہرہ نہیں ہے
یہ احسان مجھ پہ مرے دور کا ہے

یہ نفرت محبت کا ردِعمل ہے
کہ مجھ سے تقاضا، ترے جور کا ہے

نئے دور کی ابتدا کا ہے ضامن
کہ دل آئینہ گوشہ ثور کا ہے

کراچی میں بھی معتبر ہو رہا ہے
سخن میں جو انداز لاہور کا ہے

O

ہو چکی اب شاعری لفظوں کا دفتر باندھ لو
تنگ ہو جائے زمیں تو اپنا بستر باندھ لو

دوش پر ایمان کی گٹھڑی ہو، سر ہو یا نہ ہو
پیٹ خالی ہیں تو کیا، پیٹوں پہ پتھر باندھ لو

عافیت چاہو تو جھک جاؤ سرپاپوشِ وقت
پھر یہ دستارِ فضیلت اپنے سر پر باندھ لو

قاضی الحاجات سے اک عہد باندھا تھا تو کیا
اب فقیہہِ شہر سے عہدِ مکرر باندھ لو

آشیانوں میں چھپے بیٹھے ہیں سب شاہین و زاغ
تم بھی شاعر طائرِ تخئیل کے پر باندھ لو

حرف حرف روشنی

(ایک طویل نظم)

۱۹۷۴ء

(اپنے بچوں کی معرفت)

نئ نسل کے نام

○

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
سنو، یہ میری نصیحت بھی ہے وصیت بھی

میں آج تم میں ہوں موجود، کل نہیں ہوں گا
مگر جو تم ہو، تو میں ہوں سدا سلامت بھی

تم اپنا نقطۂ آغاز ہی سہی لیکن
تمہارے ساتھ رواں ہے مری روایت بھی

میں اپنے ماضی مرحوم کی امانت تھا
سو آج تم سے ہے منسوب یہ امانت بھی

مجھے جو غم ہے تو اتنا کہ اپنے ہی گھر میں
تمہارا ورثہ ہے، میرا عذاب ہجرت بھی

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
تم اس عذاب کو اک امتحاں سمجھ لینا

تم اپنے غم کا نہ دینا زمین کو الزام
کوئی یقیں بھی دلائے، گماں سمجھ لینا

وطن کے نام پہ کوئی زیادتی ہو اسے
عنایت نگہ دوستاں سمجھ لینا

یہ جبر وقت بھی تاریخ کا تقاضہ ہے
اسے بھی مرحلۂ قرض جاں سمجھ لینا

جو کوئی پوچھے تمہارا حسب نسب کیا ہے
تو میرے نام کو حرف زیاں سمجھ لینا

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
میں آج اپنی کہانی سنا رہا ہوں تمہیں

وہ راز جو میرے سینے میں دفن تھا اب تک
وہ راز اب سرِ محفل بتا رہا ہوں تمہیں

وہ خواب جس کی حقیقت ہے عالم سکرات
میں ایسے خواب گراں سے جگا رہا ہوں تمہیں

تم اپنی آنکھ سے دیکھو خود اپنے چہرے کو
کہ آج اپنا بھی چہرہ دکھا رہا ہوں تمہیں

وہ حرف حق جو سنایا نہیں گیا تم کو
سنو کہ پہلے پہل میں سنا رہا ہوں تمہیں

○

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
دروغ و مکر کا انبار ہے مری تاریخ

برائے نام خدا ہے، برائے نام ہے دیں
خدا و دیں کی گنہگار ہے مری تاریخ

نہ آدمی کی حقیقت نہ زندگی کا سراغ
فقط قصیدہ دربار ہے مری تاریخ

فقیہہ و شاعر و فن کار سب وظیفہ خوار
غلام فکر کا بیوپار ہے مری تاریخ

جو آج 'شاہی محلّہ' ہے کل یہی تھا 'حرم'
حقیقتاً پس دیوار ہے مری تاریخ

○

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
تمھیں گمان کہ دین دار تھے بہت اسلاف

وفا شعار، محبّ وطن، غریب نواز
عمل میں صاحب کردار تھے بہت اسلاف

حقیقت پس پردہ، بتاؤں کیسے تمھیں
نشے میں اپنے ہی سرشار تھے بہت اسلاف

بدلتے وقت کے تیور کو بھانپ لیتے تھے
ہر اِک گھڑی سے خبردار تھے بہت اسلاف

زمیں کی چاہ میں جاگیر کے تصور میں
بس اپنے شاہ کے غم خوار تھے بہت اسلاف

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
عجب حکایت مذموم ہے یہ افسانہ

خبر نہیں ہے کہ بین السطور میں کیا ہے
کچھ اتنا سادہ و معصوم ہے یہ افسانہ

ہجوم لفظ میں اک حرف حق نہیں ملتا
صدائے حق سے بھی محروم ہے یہ افسانہ

یہ اور بات، مرے لوگ باشعور نہیں
جبین وقت پہ مرقوم ہے یہ افسانہ

مورخین اسے کوئی رنگ دیں لیکن
مرے خدا کو تو معلوم ہے یہ افسانہ

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
میں ابتدا سے سناؤں یہ داستان عجیب

وہ آریائی تمدن ہو یا کہ سامی ہو
وہ غوریوں کی حکومت ہو یا مغل تہذیب

مری زمین کو جس نے بھی دل سے اپنایا
سمجھ لیا اسے اہل وطن نے اپنا حبیب

بڑی کتابیں جو لکھی گئیں کہ اتری ہوں
انہیں سنبھال کے رکھا ہے اپنے دل کے قریب

عجب تھی تشنگی علم میرے لوگوں کی
ہر ایک علم ہے سینے میں آج بالترتیب

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
ورود کا یہ عمل بھی مگر ہے غور طلب

کسی نگاہ میں تھی اس زمیں کی زرخیزی
حصول زر تھا کہیں حملہ آوری کا سبب

کسی کو دیں سے محبت نہ فکر و فن سے پیار
کسی نے آ کے نہ پرکھا یہاں کا علم و ادب

جو چند لوگ کہیں تھے بھی اہل دل تو انہیں
زبان کھولنے دیتا نہ حکمراں کا غضب

ہو جوگیوں کی تپسیا کہ صوفیوں کا عمل
رہا ہے سینہ بہ سینہ بہ حرف زیر لب

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
تم اپنے دیس کی مٹی اٹھا کے دیکھو تو

ہر ایک ذرہ ہے اپنے لہو میں ڈوبا ہوا
حنا سے اپنی ہتھیلی سجا کے دیکھو تو

حرم سرا ہو کہ دربار ہو کہ راج بھون
سبھی ہیں ایک، یہ دیوار ڈھا کے دیکھو تو

وہی وزیر، وہی منتری، وہی سالار
کسی کا چہرہ کسی پر لگا کے دیکھو تو

کہیں زمین سے ملتا نہیں کنار فلک
بلندیوں پہ بہت دور جا کے دیکھو تو

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
وہ لوگ اور تھے جن سے ہے یہ زمیں روشن

وہ برہمن تھے نہ مُلّا نہ جوتشی نہ فقیہہ
وہ عام لوگ تھے جن کا دلوں میں تھا مسکن

وہی جنھوں نے بتان حروف کے بدلے
دل بشر کو بنایا حیات کا مخزن

خدا کو قید معابد سے دے کے آزادی
وسیع کر دیا اس کائنات کا دامن

زمیں گواہ کہ وہ خاک بھی مقدس ہے
جہاں جہاں بھی ہیں ان اہل درد کے مدفن

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
تمھیں خبر ہے کہ انساں ہے خواہشات کا نام

جو خواہشات ہوں پوری تو یہ جہاں فردوس
وگرنہ مرگ مسلسل ہے اس حیات کا نام

خیال و خواب ہوں آزاد تو قفس بھی چمن
جو ہوں اسیر تو زنداں ہے کائنات کا نام

مگر یہ فلسفہ کیا ہے، یہ فلسفہ کیوں ہے
کہ زندگی کا ہے اثبات، قطع ذات کا نام

عوام کو یہ عقیدہ دیا گیا ہے کیوں
کہ قتل نفس ہے اک دائمی نجات کا نام

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
یہ نکتہ غور طلب بھی ہے، گفتنی بھی ہے

تمام عیش تجمل حسین خاں کے لیے
مگر ہو خواہش غالب تو کشتنی بھی ہے

عوام کے لیے ہر اک شجر ہے ممنوعہ
خواص کے لیے اللہ بڑا غنی بھی ہے

غریب ہو تو وہ قسمت کا بھی غریب مگر
امیر ہو تو وہ تقدیر کا دھنی بھی ہے

فقیہہ شہر کی اس دو رخی نے سمجھایا
ہزار چہرہ ہو راون، شکستنی بھی ہے

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
میں مانتا ہوں کہ ہر عہد خام ہوتا ہے

ہر اِک زمانہ ہے اِک حد فکر کا پابند
اور اس کی زد میں ہر اک خاص و عام ہوتا ہے

ہر ایک لمحے کی تکمیل دوسرا لمحہ
یہ وقت کا ہے سفر، کب تمام ہوتا ہے

بس اک کشاکش اضداد ہے کہ جاری ہے
قیام ہے جو بظاہر خرام ہوتا ہے

وہ فلسفہ جو حقیقت نگر نہیں ہوتا
تو اس کا رد عمل انتقام ہوتا ہے

○

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
زوال بادشہی ہے، زوال فکر قدیم

وہ جبر و قدر کے اسرار، وہ رموز عدم
وہ ماورائے حقیقت، مجاز کی تفہیم

یہ زندگی ہے قفس اور موت آزادی
وہ لامکاں میں طلسم حیات کی تجسیم

حقیقتوں سے زیادہ وہ عکس پر اصرار
وہ آدمی سے سوا اس کے سائے کی تعظیم

جنون و عشق پہ ایمان اور خرد سے گریز
یہی تھا اپنے اب وجد کا ورثۂ تعلیم

○

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
تغیرات کی زد میں ہے زندگی کا نظام

ہر اک عمل کا مقدر ہے ایک رد عمل
ہر ایک صبح کی تقدیر میں لکھی ہے شام

ہر ایک مظہر فطرت ہے آدمی کا رفیق
ہر ایک لوح پہ کندہ ہے آدمی کا نام

زمیں کو اہل سیاست نے کر دیا تقسیم
وگرنہ اہل زمیں میں ہے کوئی خاص نہ عام

یہ شرق و غرب، سفید و سیاہ، پست و بلند
ہر ایک فرق سے بالا ہے آدمی کا مقام

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
یہ عہد، عہد خرد ہے ، بہ فیض حسن عمل

گمان و وہم کے سارے طلسم ٹوٹ گئے
کہ آدمی ہی ابد ہے اور آدمی ہی ازل

نہ وہ جہان عدم ہے، وجود کا مامن
نہ یہ جہان حسیں ہے، حیات کا مقتل

خدا بھی ہے تو وہیں ہے، جہاں ہیں ہم آباد
نظر میں وہ بھی ہے موجود، جو ہے آنکھ اوجھل

یہ وقت کا ہے تسلسل، طلوع ہو کہ غروب
یہ اک عمل کا تواتر ہے، زیست ہو کہ اجل

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
تمہیں زمین پر رہنا ہے آسماں کی طرح

سمیٹنا ہے ہر اک غم کو اپنے دامن میں
کشادہ ظرفی قلب پیمبراں کی طرح

ملا ہے جو بھی تمہیں میری زندگی کے عوض
عزیز رکھنا ہے اپنی متاع جاں کی طرح

یہ رہگزر جو بچھی ہے تمہارے قدموں میں
بصد خلوص کسی نیک میزباں کی طرح

اسی وطن کی عطا ہے، اسی وطن کا کرم
جنم دیا ہے تمہیں جس نے ایک ماں کی طرح

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
تم اب جہاں بھی ہو آباد اسی زمیں پہ رہو

جو اس زمیں کا ہے ماضی، وہی تمہارا ہے
وہی تمہاری ہے تاریخ، تم کہیں پہ رہو

شجر کا رشتہ جڑوں سے تو کٹ نہیں سکتا
جہاں جہاں بھی اگے ہو، وہیں وہیں پہ رہو

تمہاری خاک بھی اس خاک ہی کا حصہ ہے
تم اپنی خاک میں مل جاؤ گے یہیں پہ رہو

خیال و خواب کی باتیں، فسانہ و افسوں
یقیں ہے اصل حقیقت سدا یقیں پہ رہو

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
ہر ایک ارض وطن کی یہی کہانی ہے

ہر اک زمین کا ہوتا ہے اپنا ایک ازل
وطن نیا سہی، تہذیب تو پرانی ہے

سراغ ملتا ہے تاریخ سے صداقت کا
یہ راز ایک حقیقت ہے اور زمانی ہے

یہ رمز وحدت اقوام میں ہے پوشیدہ
جو اپنے ربط سے ٹوٹی وہ قوم فانی ہے

ہزار گردش افلاک ہو، پہ گردش خوں
ازل سے جاری و ساری ہے، غیر فانی ہے

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
پلٹ کے دیکھو تو شاید زمانہ دکھلائے

وہ شہر جس نے تمہیں زندگی عطا کی ہے
وہ گھر کہ جس کے تصور سے تم کو نیند آئے

وہ پیڑ (ماؤں کے مانند) سائے میں جن کے
بھری دوپہر میں کچھ دیر تم بھی ستائے

وہ لوگ جن کی محبت کی تم نشانی ہو
وہ راستے جو تمہیں اپنے عہد تک لائے

وہ دور جس کے تسلسل کی اک کڑی ہو تم
تمہارے سامنے ہے آج ہاتھ پھیلائے

O

مرے لہو کے چراغو ۔۔۔ مرے جگر پارو
یہ ہاتھ ہاتھ میں لے لو کہ ہیں یہ پیار کے ہاتھ

ہزاروں سال کی بچھڑی ہوئی محبت کے
کسی کی یاد میں خاموش انتظار کے ہاتھ

خزاں کی راہ میں سرمایۂ نمو لے کر
گلوں کی آس میں بے رنگ شاخسار کے ہاتھ

ہوا کا جھونکا ہی شاید کوئی خبر لائے
کسی کی چاپ یہ رکتی ہوئی بہار کے ہاتھ

یہ ہاتھ چھوڑ نہ دینا اگر زمیں ہے عزیز
کہ ان سے بڑھ کے نہیں کوئی اعتبار کے ہاتھ

ہائیکو

(آزاد تراجم)

گوتم کا جم دن ہے
دیکھو تو یہ بن بالک، مندر کا ہے اب مالک
اور آج بھی کم سن ہے

مقدس رقص جاری ہے
ہر اک چہرے کے پیچھے آہ بھرتی جو بھی صورت ہے
وہی صورت ہماری ہے

یام کا ہر برگ ہے
قطرہ شبنم کا مامن ۔۔۔ ماں کے دامن کی طرح
زندگی کا سورگ ہے (کی۔کا۔کو)

O

کچھ نہیں ہے میرے پاس
ہاں فقط یہ گوشہ خاموش، ٹھنڈا، پرسکوں
اور دل میں تیری آس

غریب ہوں، امیر ہوں
سبھی یہ چاہتے ہیں، اس کی بزم میں جگہ ملے
اسی کے سب اسیر ہوں

مبارک ہو، کہا اس نے
مگر اس وقت جب میری جوانی کا حسیں موسم
بس اب جانے ہی والا ہے

مصیبت نہ جھیلو
کہ تم ابھی اکیلے ہو، میں بھی اکیلا
میرے ساتھ کھیلو (ایسا کو بایاشی)

(آزاد۔طبع زاد)

ستاروں کا لہو پی کر
اُبھر آتا ہے جو سورج، وہ جلتا ہے
خود اپنی آگ میں دن بھر

چل رہے تھے وائپر
کار کا شیشہ مگر شفاف تھا، میں ہنس پڑا
بھیگی آنکھیں پونچھ کر

کس لیے ہو دور دور
تم نے کیا دیکھا نہیں ہے رات کو
چاند میں سورج کا نور

سر پہ جب سورج رہا
میرے ہی پیروں تلے کچلا گیا
ہائے خود سایہ مرا

(۵۔۷۔۵)

چھوڑیں خلد کی بات
دنیا بھی اِک جنت ہے
جب تک تم ہو ساتھ

میں بندہ، وہ خدا
ہم دونوں کا ایک ہی غم
دونوں ہیں تنہا

کیا ہے راز نہاں
آنکھوں میں پل کر بھی اشک
پلکوں پر ہیں گراں

راہ کرے کیا پار
واماندہ راہی کو تو
سایہ بھی دیوار

یہ بھی سوچا ہے
سائے بڑھتے جاتے ہیں
جب دن ڈھلتا ہے

چاند ہے کیا چالاک
رات کو زیبِ تن کر لے
سورج کی پوشاک

دل ہے جس کا صاف
اُس کی تحریریں بھی ہیں
شیشے سی شفاف

پھولوں کی خوشبو
ہر جانب ہے یوں جیسے
ہر جانب ہے تو

حمایت علی شاعر کی کتابیں

شاعری

1- آگ میں پھول (نظمیں، غزلیں، رباعیات)
2- مٹی کا قرض (ثلاثیاں، نظمیں، غزلیں)
3- تشنگی کا سفر (طویل افسانوی اور تمثیلی نظمیں اور غنائیے)
4- ہارون کی آواز (نظمیں، غزلیں اور ایک طویل نظم)
5- آئینہ در آئینہ (منظوم خودنوشت سوانح حیات)
6- حرف حرف روشنی (منتخب کلام)
7- عقیدت کا سفر (سات سو سال کی نعتیہ شاعری کا انتخاب)
8- تجھ کو معلوم نہیں (منتخب فلمی نغمات)
9- چاند کی دھوپ (تازہ کلام)

تراجم

بنگال سے کوریا تک (طویل افسانوی نظم)

1. *Flower in Flames* By Prof: Rajinder Singh Verma (Panjabi University Patyala. India)
2. *Flute and Bugle* By Parkash Chander (Editor. "Times of India" Delhi)

3- (ہندی) ترجمہ نگار: پروفیسر جی این نداف (مولانا آزاد کالج، اورنگ آباد)
4- (سندھی) گل باہ مہ- ترجمہ نگار: ایم ای عالمانی (حیدرآباد، سندھ)

حرف حرف روشنی (طویل نظم اور منتخب کلام)

1. *Every Word Aglow* By Prof: Rajinder Singh Verma
2- حرف حرف روشنی (ہندی) ترجمہ نگار: بھگ تل (مہاراشٹر) Mr. C.Gaius Bhatul

3۔ شبد شبد پرکاش (ہندی) ترجمہ نگار: قاضی رئیس (مہاراشٹر)

نثری کتب

1۔ شیخ ایاز (سندھی کے جدید عہد آفریں شاعر کا مطالعہ)

2۔ شخص و عکس (مقالات، تبصرے اور مباحث)

3۔ کھلتے کنول سے لوگ (حیدرآباد دکن کے اہلِ قلم)

4۔ حمایت علی شاعر کے ڈرامے (ریڈیو اور اسٹیج ڈرامے)

تراجم

1۔ حمایت علی شاعر جا ڈراما (رشید احمد لاشاری، ایم بی انصاری، ممتاز مرزا، محمد اسحاق پیرسرہندی)

اختلافی مباحث

1۔ کسی چمن میں رہو تم (مرتب، قاصد عزیز اور نعمت اللہ)

2۔ احوالِ واقعی (مرتب، پروفیسر مرزا سلیم بیگ)

3۔ بارشِ سنگ سے بارشِ گل تک (مرتب، رعنا اقبال)

4۔ تثلیث یا ثلاثی (مرتب، رعنا اقبال)

حمایت علی شاعر۔۔۔فن و شخصیت (مقالہ برائے پی ایچ ڈی)

مقالہ نگار: رعنا اقبال (ڈپٹی ڈائریکٹر ریسرچ وانفارمیشن، وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی)

منتظرِ اشاعت

1۔ نقطۂ نظر (تحقیقی اور تجزیاتی مضامین)

2۔ مہران موج (سندھ کی عوامی کہانیوں کا تمثیلی روپ)

3۔ چنگاریاں (اردو شاعرات کا مطالعہ)

4۔ نئی پود (نئی نسل کے اہلِ قلم)